© rasailojaraid.com

امریکی سلطنت اور اسلامی دہشت گردی

جیمز کرتھ*

ترجمہ: فخرالاسلام

گزشتہ دو سالوں سے بین الاقوامی امور کے اہل قلم دنیا میں امریکی کردار کے حوالے سے ایک نئی اصطلاح (جو اتنی نئی بھی نہیں)۔ ''امریکی سلطنت/شہنشاہیت'' استعمال کر رہے ہیں۔ بے شمار مضامین اور کتابوں میں اس ''امریکی سلطنت'' کی پیدائش کا اعلان کیا گیا۔ یہ سلطنت چار پہلوؤں سے امریکہ کی اعلیٰ ترین حیثیت (supreme position) کی نمائندگی کرتی ہے: اول، دنیا کی واحد سپر پاور بلکہ ہائیر پاور کے طور پر، دوم، واحد ہائی ٹیک ملٹری پاور اور ''فوجی معاملات میں انقلاب'' کے لیڈر کے طور پر، سوم، عالمی اقتصادیات میں سب سے بڑی اور ترقی یافتہ اقتصادی طاقت اور گلوبلائزیشن کے فروغ میں اپنے قائدانہ کردار کی بنا پر، اور چہارم، ''سوفٹ پاور'' میں ایک مثال قائم کرنے اور مقبول امریکی ثقافت کو دنیا بھر میں فروغ دینے کی بنا پر۔

ان چاروں پہلوؤں سے امریکہ کی اعلیٰ ترین حیثیت ۱۹۸۰ء میں مستحکم ہونا شروع ہو چکی تھی تاہم اس وقت سوویت یونین کی فوجی اور جاپان کی معاشی طاقتیں اس کی راہ میں حائل تھیں۔ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے انہدام اور اسی سال جاپانی معیشت پر کساد بازاری نے دونوں روڑے ہٹا دیے۔ پھر ۱۹۹۰ء کے عشرے میں امریکہ فوجی اور معاشی ترقی کی اس معراج پر پہنچا جس کے بعد اس کی برتری ناقابل انکار حقیقت بن گئی اور بین الاقوامی سیاست کو نئے عنوانات ملنے لگے۔

نئی صدی اور ہزاریے کے ساتھ ہم ایک نئی امریکی شہنشاہیت سے بھی آشنا ہوئے۔ تاہم یہ کوئی پہلی عالمی سلطنت نہیں ہے۔ اس سے پہلے سولھویں تا اٹھارہویں صدی میں ہسپانوی اور انیسویں و بیسویں

* James Kurth, "Confronting the Unipolar Moment: The American Empire and Islamic Terrorism", *Current History*, Dec. 2002, pp. 403 - 409.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صدی کی برطانوی سلطنت بھی اپنی وسعت کے اعتبار سے عالمگیر تھی۔ تاہم ان کا معاملہ ذرا مختلف تھا کہ انہیں معاصر سامراجی طاقتوں کا مقابلہ درپیش تھا جبکہ امریکہ اس وقت نہ صرف واحد سپر پاور اور ہائپر پاور ہے بلکہ ایک واحد ایمپائر بھی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے اگر ماضی کی طرف دیکھیں تو رومن ایمپائر (سلطنت روما) پر نظر پڑتی ہے مگر وہ بھی آج کے معنوں میں عالمی سلطنت نہیں تھی۔

امریکہ ہر حیثیت سے سابقہ سلطنتوں سے مختلف ہے۔ ایک واحد عالمی سلطنت جو اقوام عالم کو اپنی شبیہہ پر دوبارہ تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ اس کے سیاسی اور معاشی اشرافیہ کے لوگ امریکی تصورات کو ہمہ گیر قرار دے رہے ہیں۔ ان کے مطابق یہ تصورات ''اعلان آزادی'' میں بیان کردہ تصورات یعنی حق زندگی، آزادی اور مُسرت کی تلاش کے عین مطابق ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں حال ہی میں شائع شدہ ایک کتاب کے مصنف مائیکل مینڈل بوم (Michael Mandelbaum) کے الفاظ میں ان تصورات کا خلاصہ ہے ''امن، جمہوریت اور آزاد معیشت''، اور یہ وہ تصورات ہیں جنہوں نے دنیا کو فتح کر لیا ہے۔

اسلامی دہشت گردی کا عروج

امریکہ کی عالمگیر سلطنت کا خوفناک مدمقابل ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک کے عالمی مرکز تجارت اور پنٹاگون پر حملے کی شکل میں سامنے آیا گویا کہ دہشت گردی کے اس واقعے کے ملزم بھوتوں کی طرح امریکی استعمار کا پیچھا کر رہے ہیں۔ امریکہ اور اسلامی دہشت گردوں کا بیک وقت عروج محض اتفاق نہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک جدلیاتی تعلق موجود ہے۔

۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد امریکیوں کی زبان پر ایک ہی سوال تھا ''یہ لوگ (مسلمان) ہم سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ہر ایک نے اپنی سمجھ کے مطابق دیا تاہم عالمگیریت کی مخالف تحریک کے حامیوں اور امریکی بائیں بازو کے مخالفین نے اس کا جواب دیا کہ یہ اس لیے کہ امریکہ اپنی غالب قوت کے ساتھ ان کے معاشروں میں نفوذ کر رہا ہے ــــ یعنی امریکہ ظالمانہ طریقے سے اپنی سلطنت میں توسیع کر رہا ہے اور ان دو قوتوں کے درمیان علت و معلول کا یہی تعلق ہے۔

۱۱ ستمبر کے واقعے کے ایک سال بعد بش انتظامیہ نے اس حوالے سے ایک اور موقف اختیار کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹ستمبر ۲۰۰۲ء کو انتظامیہ نے ''امریکہ کی قومی سلامتی کی حکمت عملی'' کے عنوان سے ایک دستاویز جاری کی جس میں کہا گیا کہ امریکہ اور دنیا کو اس وقت بیک وقت دو خطرات کا سامنا ہے یعنی دہشت گردی کا جال اور بڑے پیمانے پر تباہ کن ہتھیار تیار کرنے والی بدمعاش ریاستیں۔ دہشت گرد کسی بھی وقت یہ ہتھیار حاصل کر کے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں، چنانچہ اس خطرے کی روک تھام ضروری ہے۔ دستاویز میں کہا گیا کہ اس بے مثال خطرے کے خلاف بے مثال اقدامات کرنے پڑیں گے۔

یک طرفہ پیش بندی (preemption) کی حکمت عملی

عالمی امریکی طاقت اور اسلامی دہشت گردی کے دورِ نو میں بش انتظامیہ نے پیشگی حملے کا انوکھا تصور دنیا کو دیا (یعنی جس ملک سے خطرہ ہو اس پر حملہ کر دیا جائے قبل اس کے کہ وہ تم پر حملہ آور ہو)۔ یہ حملے امریکی دانست میں بدمعاش ممالک (مثلاً عراق) کے خلاف ہوں گے جن کی طرف سے دہشت گردوں کو مہلک ہتھیاروں کی فراہمی کا امکان ہو۔ امریکہ چاہے گا کہ ان حملوں کو بہت سارے ممالک کی حمایت حاصل ہو، بالخصوص اقوام متحدہ اور نیٹو ان کی جائز قرار دیں لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو امریکہ از خود اکیلے بھی جنگ سے دریغ نہیں کرے گا۔

امریکہ کی نئی پالیسی اس کے پرانے نظریات یعنی تحدید (containment) اور باز رکھنے (deterence) کی جگہ لے گی۔ بش کے ۲۰۰۲ء کے اس نظریے کا موازنہ ۱۹۴۷ء میں اس وقت کے صدر ٹرومین کے نظریہ تحدید (policy of containment)، ۱۹۵۰ء کی قومی سلامتی دستاویز این ایس سی-۶۸ سے کیا جا سکتا ہے، جو ایٹمی تحدید (nuclear deterence) کے اصول پر مبنی تھے۔

بش انتظامیہ خطرناک ممالک کو مہلک ہتھیاروں سے نہتا کرنے سے بڑھ کر پیشگی حملوں کے ذریعے سزا دینا چاہتی ہے۔ اس پالیسی کے تحت وہ برسر اقتدار حکومتوں کو ہٹا کر اپنی حمایت یافتہ حکومتوں کو اقتدار پر فائز کرانا چاہتی ہے۔ اس کا یہ بھی ارادہ ہے کہ ان ممالک میں موجودہ سیاسی و معاشی نظاموں کی جگہ ایک ایسا نظام قائم کریں جو آزاد جمہوریت، آزاد معیشت اور کھلے سماج (open society) کے تصورات پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبنی ہو۔ مختصراً بش انتظامیہ کا خیال ہے کہ ان پیشگی حملوں سے ان (مذکورہ) امریکی تصورات کی ایک نئی توسیع ممکن ہوگی جنھوں نے ''دنیا کو فتح کر لیا ہے''۔ یہ امریکی قلمرو کی جدید توسیع کا آغاز ہوگا اور اس عمل کا پہلا نشانہ عراق ہوگا۔*

عالمگیریت اور امریکی بائیں بازو کے مخالفین کا یہ خیال ہے (اور شائد اسلامی دہشت گرد خود بھی یہی خیال رکھتے ہیں) کہ امریکی سلطنت کے عروج نے اسلامی دہشت گردی کو فروغ دیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف امریکی انتظامیہ اور سیاسی و معاشی اشرافیہ کا موقف یہ ہے کہ یہ تو اسلامی دہشت گردی تھی جو امریکی سلطنت کی توسیع کا باعث بنی۔ غالباً یہ دونوں نظریات اپنی جگہ صحیح ہیں۔ دونوں کے درمیان علامتی اور جدلیاتی تعلق نظر آتا ہے اور عنقریب دنیا ان دونوں قوتوں کے درمیان تباہ کن کشمکش کا مشاہدہ کرنے والی ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی: چار کرداروں کا ایک ڈرامہ

عام طور پر دنیا میں امریکی غلبے کو چار پہلوؤں سے اس کی برتری یعنی واحد عالمی قوت، فوجی برتری، معاشی طاقت اور ثقافتی نفوذ کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اس کے ڈانڈے امریکہ کی داخلی سیاست سے بھی ملتے ہیں۔ دنیا میں امریکی کردار کے حوالے سے خود امریکہ میں چار مکتب ہائے فکر پائے جاتے ہیں یعنی (۱) روایتی آزاد خیال، (۲) روایتی قدامت پسند، (۳) جدید آزاد خیال اور (۴) جدید قدامت پسند۔ والٹر رسل میڈ نے ان چار مکاتب فکر کو امریکی خارجہ پالیسی کی چار تاریخی روایات قرار دیا ہے۔ انھوں نے ان مکاتب کو بالترتیب جیفرسنی (Jeffersonian)، جیکسنی (Jacksonian)، ولسنی (Wilsonian) اور ہملٹنی (Hamiltonian) روایات کے نئے عنوان دیے**۔ لیکن عصری گروہ ان تاریخی روایات

---

*یاد رہے کہ یہ مضمون سقوط بغداد ۲۰۰۳ء سے قبل تحریر کیا گیا تھا۔

**مذکورہ بالا امریکی صدور نے اپنے انداز سے عالمی سیاست میں امریکہ کے کردار کے نظریات پیش کیے۔ بطور مثال جیفرسن امریکی جمہوری اقدار کے اپنے ملک کے اندر فروغ کے حامی تھے نہ کہ امریکہ سے باہر۔ اسی طرح جیکسن غیر ملکیوں کی بجائے امریکی لوگوں کی سلامتی اور معاشی بھلائی کے لیے کوشاں تھے تاہم ولسن جمہوری اقدار کو دنیا بھر میں پھیلانے کے حق میں تھے، جبکہ ہیملٹن امریکہ کے کاروباری مفادات کو عالمی سطح پر فروغ دینا چاہتے تھے۔ دیکھیے: Waltar Rassell Mead, *Special Providence: American Foreign Policy and How It Changed the World* (New Yark: Knopf, 2002)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کئی اہم پہلوؤں سے مختلف ہیں۔

بیسویں صدی میں زیادہ تر روایتی آزاد خیال لوگ امریکی سیاست پر حاوی تھے۔اس گروہ کا مطمح نظر فقط یہ تھا کہ امریکی قومی معیشت کو سماجی اصلاحات کے ذریعے ترقی دی جائے۔ چنانچہ امریکی خارجہ پالیسی بھی اسی مرکزی نکتے کے گرد گھومتی تھی کہ امریکی معیشت کی حفاظت کی جائے اور غیر ملکی معاملات میں دخل اندازی سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے معیشت پر منفی اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ تھا (مثال کے طور پر ویت نام کی جنگ نے امریکی معیشت کو بری طرح متاثر کیا)۔اس مکتب فکر کی روایت کی بہترین نمائندگی ماضی قریب میں کارٹر انتظامیہ نے کی۔

دوسری طرف روایتی قدامت پرستوں کی خواہش یہ رہی ہے کہ قومی اتحاد کی طاقت سے امریکہ کی سلامتی کو یقینی بنایا جائے۔وہ سمجھتے ہیں کہ امریکی خارجہ پالیسی اس کی سلامتی کی پشتی بان ہو اور امریکہ کو بین الاقوامی امور میں براہ راست مداخلت سے باز رہنا چاہیے۔کیونکہ ایسی صورت میں ایک تو امریکہ کمزور ہوگا دوسرا یہ کہ اس کے دشمنوں میں اضافہ ہوگا۔اس مکتب فکر کی صحیح ترجمانی بش سینئر نے کی تھی باجود اس کے کہ ان کے نئے عالمی نظام (New World Order) کا نعرہ روایتی قدامت پرستی سے متصادم تھا۔

مذکورہ بالا روایتی مکاتب فکر (روایتی آزاد خیال و روایتی قدامت پرست) ایک نکتے پر متفق نظر آتے ہیں۔وہ یہ کہ دنیا کی قومی ریاستوں (National States) میں امریکہ بھی ایک قومی ریاست ہے اور دوسرے ممالک سے اس کے تعلقات اسی لحاظ سے قومی یعنی امریکیوں کے مفاد کے تحفظ اور فروغ کے اصول کے تحت تشکیل پاتے ہیں۔

روایت پسند گروہوں کے علی الرغم دونوں جدت پسند مکاتب (جدید آزاد خیال اور جدید قدامت پرست) امریکہ کو عالمی میدان کی ایک بے مثال طاقت سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں عالمی منظرنامے پر کئی کردار نظر آ رہے ہیں لیکن ان سبھوں کی قوت اور اثر امریکہ کے مقابلے میں فروتر ہیں۔یہ دونوں گروہ دنیا کو یک قطبی سمجھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ امریکہ دنیا کی معیشت اور سماج کا نیا رخ متعین کرے گویا وہ امریکہ کو عالمگیریت (Globalization) کے نئے منصوبے میں قائدانہ کردار دینے کے متمنی ہیں۔ان کی خواہش ہے کہ ایک ایسا عالمی نظام قائم کیا جائے جس کی بنیادیں آزاد جمہوریت، منڈی کی معیشت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آزاد سماج پر استوار ہوں۔ یہ عالمی نظام ''جمہوری امن'' کا بھی علم بردار ہوگا کیونکہ ان گروہوں کے خیال میں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جن ممالک میں آزاد جمہوری نظام مستحکم رہا وہ کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں لڑے۔ حالیہ مثالوں میں سابق صدر کلنٹن کی انتظامیہ اس مؤقف کی نمائندگی کرتی ہے۔

جدید قدامت پسندوں کی دلچسپی ہمیشہ عالمی سلامتی میں امریکہ کے کردار سے رہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ امریکہ اپنی بے پناہ طاقت اور اثر سے اپنی اور اتحادیوں کی سلامتی کو لاحق فوجی اور دہشت گردی کے خطرات کا مقابلہ کرے۔ (ان اتحادیوں میں اسرائیل سرفہرست ہے جس کے اردگرد کا ماحول دنیا میں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے۔) ان کا منصوبہ یہ ہے کہ بدقماش ریاستوں (rogue states) اور دہشت گردوں سے مرحلہ وار پروگرام کے تحت جان چھڑائی جائے۔ خاص طور پر ان سے جن کی رسائی انسانی تباہی کے ہتھیاروں (WMD) تک ہے۔ ماضی قریب میں صدر ریگن کا دور اول اس مکتب فکر کا ترجمان تھا۔ اس دور میں ریگن نے سوویت یونین کے خلاف سخت فوجی پالیسی اپنائی اور کمیونسٹ حکومتوں کے خلاف جاری چھاپہ ماروں کی مدد کی۔

صدر جارج ڈبلیو بش کے عہد میں جدید قدامت پسندی اپنی معراج پر پہنچی ہے۔ اس کا اظہار بش انتظامیہ کی مشرق وسطیٰ کے حوالے سے پالیسی سے ہو رہا ہے جس میں اسرائیل کی حمایت اور عراق سے جنگ کی تیاریاں شامل ہیں۔ بش جونیئر نے جدید قدامت پسندی میں ''پیشگی حملوں'' (preemptive attacks) کا عنصر بھی شامل کر دیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بش انتظامیہ میں موجود جدید قدامت پسندوں اور جدید آزاد خیالوں نے آپس میں اتحاد کر لیا ہے۔ ان میں سے جدید قدامت پسند محکمہ دفاع پر حاوی ہیں جبکہ وزارت خارجہ جدید آزاد خیالوں کے زیر اثر ہے (اگرچہ دونوں جگہوں پر کچھ استثنائی صورتیں بھی ہیں)۔ ماضی میں اسرائیل کے حامیوں اور تیل کی صنعت سے وابستہ عہدیداروں میں مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی پر اختلافات رہے ہیں لیکن اب جب عراق میں حکومت تبدیل ہوگی تو دونوں کی مراد بر آئے گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکی سلطنت کا عروج: چار ایکٹ کا ایک ڈرامہ

بیرونی خطرات اور امریکی توسیع پسندی میں اضافہ جیسے رجحانات جو آج سامنے آئے ہیں وہ نئے نہیں بلکہ ماضی میں بار ہا ایسا ہوتا رہا ہے۔ امریکہ کئی فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں تباہی کا تجربہ کر چکا ہے۔ ان کارروائیوں نے ایسی امریکی جنگوں کو بھڑکایا جن سے خاص طور پر امریکی قوت کے پھیلاؤ اور امریکی سلطنت کی توسیع کے حوالوں سے حیرت انگیز نتائج پیدا ہوئے۔

۱۲ اپریل ۱۸۶۱ء کو قلعہ سمٹر (Sumter) پر نیم وفاقی (Confederate) فوجوں کے حملے سے امریکی خانہ جنگی بھڑک اٹھی۔ ابتداء میں شمالی ریاستوں کی خواہش تھی کہ جنوبی ریاستوں کو وفاق میں شامل کیا جائے لیکن جنگ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ریاست ہائے متحدہ کے لیے اس کے حقیقی نتائج کہیں زیادہ تھے اور ایک ایسی مضبوط اور قومی ریاست کے قیام تک پھیل گئے جس کی سرحدیں بحرالکاہل کے ساحلوں تک وسیع ہوں۔ یہیں سے سلطنت امریکہ کا آغاز ہوا جس نے براعظموں میں آزاد جمہوریت اور آزاد معیشت کے استحکام کا بیڑہ اٹھایا۔ طاقت کے بل پر اس توسیع پسندی کے اثرات شمالی امریکہ تک محدود نہ رہے بلکہ کیریبین اور کیوبا تک پھیل گئے۔ اس کے نتیجے میں یہ ہسپانوی نو آبادی جنگ کا نیا میدان بن گئی۔

۱۵ فروری ۱۸۹۸ء کو ہوانا کی بندرگاہ پر امریکی جنگی جہاز یو ایس ایس مائین (USS Maine) کی تباہی اگرچہ حملے نہیں بلکہ اندرونی خرابی کے سبب ہوئی تاہم امریکہ نے اس کا الزام ہسپانوی افواج کو دیا جس کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ابتداءً امریکہ کے سامنے اس جنگ کا مقصد یہ تھا کہ کیوبا اور پیورٹو ریکا کو ہسپانوی قبضے سے آزاد کرایا جائے لیکن جنگ کے حقیقی نتائج اس سے کہیں بڑھ کر نکلے اور امریکی دائرۂ اثر کیریبین اور وسطی امریکہ تک پھیل گیا۔ بالفاظ دیگر یہ آزاد جمہوریت و معیشت کی حامل امریکی سلطنت کے اثرات کو نصف کرۂ ارض کے پیمانے پر توسیع دینے کی کوشش تھی۔ اسی پر بس نہیں بلکہ توسیع پسندی کی اس خواہش نے امریکہ کو مغربی نصف کرے سے آگے بحرالکاہل کے دوسری طرف پہنچا دیا اور جزیرہ ہوائی کو امریکہ میں شامل کر لیا گیا حتیٰ کہ فلپائن تک رسائی ہو گئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے نے امریکہ کو جنگ عظیم دوم میں کود پڑنے پر مجبور کر دیا۔ آغاز میں امریکہ کا مقصد جاپان اور جرمنی کو شکست دینا تھا تاہم اس کے حقیقی نتائج کہیں بڑھ کر سامنے آئے اور امریکی اثر و رسوخ کا دائرہ مغربی یورپ اور شمال مشرقی ایشیاء تک وسیع ہو گیا۔ گویا آزاد معیشت اور جمہوریت کی توسیع اب حقیقتاً آدھی دنیا یا ''آزاد دنیا'' کے پیمانے پر ہونے لگی۔ یہ وسعت پذیری کی خواہش یوریشیا کے دو اختتامی خطوں اور ان علاقوں تک پہنچی جو ان کے درمیان واقع ہیں۔ یہاں پر مشرق وسطیٰ واقع ہے جس کا تیل امریکہ اور مغربی یورپ و شمال مشرقی ایشیا میں اس کے اتحادیوں کے لیے ضروری تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کی موجودگی پانچ عشروں بعد ایک اور اچانک حملے (surprise attack) اور پھر اس کے جواب میں شروع کی جانے والی جنگ کا باعث بنی۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو عالمی تجارتی مرکز اور امریکی محکمہ دفاع پر اسلامی دہشت گردوں کے حملے نے امریکہ کو ۲۱ویں صدی کی پہلی جنگ میں دھکیل دیا۔ ابتداء میں یوں لگ رہا تھا کہ امریکہ کسی قومی ریاست پر حملہ کرنے کی بجائے دہشت گردوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنائے گا۔ تاہم انہوں نے ان ممالک کو بھی نشانہ بنانے کا اعلان کر دیا جو دہشت گردوں کو پناہ گاہیں مہیا کر رہے تھے جیسے افغانستان میں طالبان کی حکومت۔ دوسری طرف جنوری ۲۰۰۲ء میں امریکہ نے ممکنہ دشمنوں کی نئی تعریف سامنے لاتے ہوئے ''بدی کے محور'' کا لیبل چسپاں کر کے ایسے ممالک کی نشان دہی کی جو بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار حاصل کر رہے تھے۔ ان میں بطور خاص ایران، عراق اور شمالی کوریا شامل تھے۔ چنانچہ عراق کے خلاف نئی جنگ کا دوسرا دور اتنا بھی نیا نہیں۔

عراق پر حملے کا جواز امریکہ نے یہ بھی پیش کیا ہے کہ اس سے نہ صرف عراق میں بلکہ ایران، شام اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک میں منڈی کی معیشت اور جمہوریت کو استحکام نصیب ہوگا۔ آزاد رُو جمہوریت اور معیشت پر مبنی امریکی سلطنت میں توسیع پسندی کی یہ ایک اور چھلانگ ہے جس کے ذریعے اب وہ شاید پوری دنیا کو اپنے لپیٹ میں لینے کا ارادہ کر چکا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکی سلطنت کا مستقبل اور جنگ کی دھند

جیسا کہ قلعہ سمٹر، یوالیس مائین اور پرل ہاربر کے ہر ایک واقعہ کے سال یا زیادہ عرصہ بعد تک نتیجے کا علم نہ ہو سکا اسی طرح ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے ایک سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی یہ واضح نہیں کہ نتائج کیا سامنے آئیں گے۔ اگر چہ یہ تو واضح ہے کہ امریکہ اپنی سلطنت کو شمالی امریکی براعظم کے ساحلوں سے عظیم تر گلوب کے باہری کناروں تک وسعت دینے کے نئے لانگ مارچ پر روانہ ہونے والا ہے۔ امریکی سامراجی ڈرامے کے اس چوتھے منظر کا اختتام کیسے ہوگا؟ اس کے لیے ہمیں عراق پر امریکی حملے اور خود امریکہ پر القاعدہ کے ممکنہ حملوں کے نتائج کا انتظار کرنا ہوگا۔

عراق پر امریکی قبضے کے نتیجے میں اس کی سلطنت وسعت اختیار کر جائے گی لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ خود امریکہ میں اور دیگر ممالک میں امریکی مخالفت میں بھی شدت آ جائے گی۔ امریکی سامراجیت اور اس کی مخالفت کی جدلیت اس سے پہلے بھی واضح ہو چکی ہے۔ یاد رہے کہ کیریبین اور فلپائن پر امریکی طاقت کے ظہور کے ساتھ ہی خود ریاست ہائے امریکہ اور لاطینی امریکہ میں سامراج مخالف تحریکیں برپا ہوئی تھیں۔ بعینہٖ جنگ عظیم دوم کے بعد مغربی یورپ پر امریکی اثرات کی مخالفت میں وہاں کے روایتی قدامت پرستوں اور بائیں بازو کے انتہا پسند گروہوں نے امریکہ اور یورپ میں تحریکیں منظم کیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ عراق پر امریکی حملے کے نتائج سے ہم کم از کم تاریخی لحاظ سے پہلے ہی واقف ہیں۔

لیکن اگر اسی دوران اسلامی دہشت گرد امریکہ کے اندر کامیاب کارروائیاں کرتے ہیں تو امریکی احساس تحفظ اور اعتماد کی عمارت منہدم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی شائد امریکی سلطنت کی اندرونی حمایت میں بھی کمی آ جائے۔ بہر حال اس کے نتائج کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ کوئی بھی واقعہ ہو امریکہ میں دہشت گردی کے کامیاب واقعات کے تسلسل کی منطق سے ایسی کہانی جنم لے گی جس کے بارے میں ہم اس سے پہلے کچھ نہیں جانتے۔

تاہم، سب سے دلچسپ امکان کے طور پر، دونوں قوتوں کی کامیابیوں کے متوقع نتائج یہ ہوں گے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اولاً عراق پر امریکی قبضے سے اس کی سلطنت کی توسیع آسان تر ہو گی ثانیاً اگر دہشت گرد امریکہ کے اندر کارروائیاں کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو پھر وسعت پذیر امریکی سلطنت ایک ضرورت بن جائے گی۔

صحیح راستے کے انتخاب میں غلطی

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعے کے بعد صدر بش نے جس راستے کا انتخاب کیا وہ یہ تھا کہ القاعدہ اور ان کو پناہ دینے والے طالبان کو سزا دی جائے۔ دیگر ممالک نے امریکی موقف کی تائید کی اور یوں امریکہ کثیر الاطراف (multilateral) پالیسی پر عمل پیرا ہو کر میدان میں اُترا۔ اس پالیسی کی تائید امریکہ کے قدامت پرستوں اور آزاد خیالوں کے روایتی گروہوں نے بھی کی۔

شاید امریکہ کے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ بین الاقوامی دہشت گردی کا انسداد دیگر ممالک کے تعاون سے کریں نہ کہ قومی ریاستوں کے خلاف یک طرفہ فوجی کارروائی کی جائے۔

[جیمز کرتھ، فلاڈیلفیا میں فارن پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سینئر فیلو اور سوارتھ مور کالج میں کلاڈ سمتھ پروفیسر آف پولیٹیکل سائنس ہیں۔]

© rasailojaraid.com